باسمہ تعالیٰ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

پرویز

باسمہ تعالیٰ

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

کہا جاتا ہے کہ بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از قیاس ہوتی ہیں۔ اس کی بیّن مثال خود ہماری اپنی داستان ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک قوم اپنے سامنے ایک بلند و بالا متعیّن، واضح اور روشن نصب العین رکھتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے دس سال تک مسلسل مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ اس جدّ و جہد میں ساری دنیا سے لڑائی مول لیتی ہے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صبر آزما مصائب جھیلتی ہے۔ لیکن جب دس سال کی اس مسلسل جدّ و جہد کے بعد وہ نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو سوچنے بیٹھتی ہے کہ ہم نے اس کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ اس کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ ان سوالات کے ابھارنے والوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو اس جنگ میں خود شریک تھیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ دراصل ہندوؤں کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی (بقول ان کے) اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی ہندوستان سے الگ نہ ہوتے۔ بالفاظِ دیگر اگر وہ آج بھی ذرا وسعتِ قلبی کا ثبوت دیں تو ہم ان سے فوراً گلے مل جائیں۔ دوسری طرف سے ...... یہ آواز اٹھی کہ مسئلہ دراصل معاشی تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے اس کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ہم بڑے بڑے کارخانے لگاتے، عظیم القدر الوانات تجارت قائم کرتے، بڑی بڑی جائدادیں کھڑی کرتے۔ ہم نے پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ یعنی (بقول ان کے) یہ چند سرمایہ داروں اور زر پرستوں کی اسکیم تھی جس کے لئے قوم نے ایسی مہیب جنگ لڑی تھی۔ بعض ایک قدم آگے بڑھے اور یہاں تک کہنے میں بھی نہ کوئی باک سمجھا نہ شرم محسوس کی کہ تقسیمِ ہند درحقیقت انگریز کی اسکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔

حصولِ پاکستان کا مقصد

حصولِ پاکستان سے مقصود کیا تھا اس کے متعلق میں اپنے اس مقالہ میں بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو "نوائے وقت" کی ۷ ار اکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا: کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ اس میں، مَیں نے مستند حوالوں سے ثابت کیا تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام رائج کیا جا سکے۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے میں یہاں قائدِ اعظمؒ کے وہ چند الفاظ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) میں ارشاد فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہِ جواز کیا تھی؟ تقسیمِ ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔
>
> (قائدِ اعظمؒ کا پیغام مرتبہ سید قاسم محمود صفحہ ۵۲)

جو لوگ تقسیمِ ہند کو انگریزوں کی سکیم قرار دیتے ہیں اور قائدِ اعظمؒ کو ان کا آلۂ کار ٹھہراتے ہیں ان کے خبثِ باطن کے علاوہ، ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف انگریزوں جیسی قوم تھی جس کی سلطنت پر (اس کے زمانے میں) سورج تک غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ہندو تھا جس کے پاس برلاؤں اور ٹاٹاؤں کی تجوریاں تھیں۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی زیرِ زمین دہشت پسند تنظیمات تھیں۔ ان کے مقابلے میں ایک نحیف و نزار سی دبیلہ شخصیت تھی جس کے پاس نہ دولت کے خزانے تھے، نہ لاؤ لشکر، نہ خفیہ تنظیمیں تھیں، نہ پوشیدہ اسلحہ۔ وہ تنہا بے ساز و یراق یہ جوکھم لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی قوت تھی اور وہ تھی عظمتِ کردار کی بے پناہ طاقت۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے پاکیزہ عملِ پیہم۔ چونکہ آج ہماری قوم بدقسمتی سے اس تصور ہی سے بیگانہ ہو چکی ہے کہ حسنِ کردار کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے اور اس سے بے ساز و سامان کیسے کیسے محیر العقول کارنامے ظہور میں آ سکتے ہیں، اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ حصولِ پاکستان کا راز اس معمارِ پاکستان کے یقینِ محکم، عزمِ بلند اور بے لوث کردار میں مضمر تھا۔ میں صحبتِ امروزہ میں اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی کوشش کروں گا، بالخصوص اس اعتراض کی تردید کہ تقسیمِ ہند کی سکیم انگریز کے ذہن کی اختراع تھی اور قائدِ اعظمؒ اس کے اس مقصد کے حصول کے آلۂ کار تھے۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریکٹر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے، اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو وہ اپنی

؎ یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے اور پمفلٹ کی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔

گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کی شہرت داغ دار ہو جائے۔ لہٰذا، ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال، کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتے۔ کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اس نے ہنوز کوئی مقام بلند حاصل نہ کیا ہو، اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہے، اس میں تصنع اور آورد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان میں اس کے جوہر کردار کی حقیقی جھلک دکھائی دے سکتی ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ نبی اکرم سے مخالفین نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

میں نے اعلانِ نبوت سے پہلے، جب میری حیثیت معاشرہ کے ایک عام فرد کی سی تھی، تمہارے اندر زندگی گزاری ہے، میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا!

حضورؐ کے اس جواب نے (جو بزبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماپنے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق، قائداعظمؒ کے کردار کی داستان، ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور سے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ء سے کیا جاتا ہے۔ جب مانٹیگو، چیمسفورڈ سکیم کے سلسلہ میں، اس زمانے کے وزیرِ ہند، مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ انہوں نے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں، تلک، گوکھلے، دادا بھائی نوروجی کے علاوہ، مسٹر محمد علی جناحؒ سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جوان سال سیاست دان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کئے:۔

ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی۔ وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناحؒ کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح الجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناحؒ جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد، مسٹر جناحؒ نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت نامساعد تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا۔ لیکن اس پر بھی بساطِ روزگار پر اس نووارد کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ علاقہ کے سربراہ سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیش کش کی جس کا مشاہرہ اس زمانے میں پندرہ سو روپیہ تھا، تو مسٹر جناحؒ نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دے کر مسکرا دیا لیکن تھوڑے سے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک خود خریدہ نوجوان کی

خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

(۰)

یہ پہلی جنگِ عظیم کے آخری دور کی بات ہے اس جنگ میں گو اتحادیوں کو بہ حیثیتِ مجموعی کامیابی حاصل ہو رہی تھی لیکن ان جراحت ہائے پیہم سے برطانیہ کی حالت بسمل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم، انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومتِ ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناح ؒ کو ایسا موقع خدا دے، وہ اس زمانے میں مسز اینی بسینٹ کی قائم کردہ، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہلِ ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا :۔

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے ؟ باوجود اتنا خون بہانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے ؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں! آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے ..... یہ جنگ، آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی ؟ کیا اربابِ حکومت فاترالعقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے ! یاد رکھئے کہ یہ اندازِ حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناح ؒ کے اس نعرۂ حریت کا اثر تھا کہ وزیرِ ہند کو دارالعوام میں اعلان کرنا پڑا کہ

> ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومتِ برطانیہ کے اس حصّے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادئ ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو قائدِ اعظم محمد علی جناح ؒ کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

وزیرِ ہند نے تو حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سرپھرے انگریز حکمران تھے جو نشۂ قوت میں بدمست، اس تصور تک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سڈنہم اور لارڈ ولنگڈن کا نام سرفہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے، اس صوبۂ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناح ؒ کا مسکن تھا۔ جناح ؒ نے ان دونوں سے جس بے باکانہ انداز سے ٹکر لی وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا نہایت ولولہ انگیز باب ہے۔

لارڈ سڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے، تو یہ سرمستِ بادۂ حریت، بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سڈنہم کا نام لے کر کہا کہ

> یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول

> ہیں۔ اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہ نمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اس دَور میں جرأت و بے باکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناحؒ کو اس کا علم تھا۔ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اہالیانِ شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسٹر جناحؒ انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے، لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناحؒ نے وہاں جوشیلی انگیز تقریر کی، اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کا یہ دن، بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

اہلِ بمبئی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناحؒ میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبۂ بے باکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں، ایک ہندو لیڈر مسٹر بی۔ جی۔ لاٹھ نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک درخشندہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:۔

> کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناحؒ ہیں، جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناحؒ کے عزمِ صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں، دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی رُوح جلوہ گر نظر آتی ہے...... انہوں نے عوام کے حقوق کی راہ نمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِّ وطن کی حیثیت سے، ان کا نام ہمیشہ کے لئے دلوں میں تر و تازہ رہے گا..... مسٹر جناحؒ ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں!

یہ واقعہ تو لارڈ ولنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی، مسٹر جناحؒ نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی اس زمانہ میں، شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی

استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناح کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے ایڈریس میں، اہلِ ہند سے جنگ میں عملی تعاون کی اپیل کی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناح اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔

مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ.... ہز ایکسیلینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے۔ اور ایکسیلینسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں — لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریکِ کار نہ بنایا جائے۔

مسٹر جناح تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے، اور دوسری طرف مسٹر گاندھی، جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، وائسرائے کو ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ

میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادرِ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناح نے حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف، صرف وار کونسل کی اس کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ وہ مختلف مواقع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ یہ استعفےٰ جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ

حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانہ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوف تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے

> روند ڈالا ہے، جن کے لئے حکومت برطانیہ نے جنگ لڑی تھی ---- انصاف کے بنیادی اصولوں کا خون اس وقت استعمال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ---- ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اُسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو، تعاون کرنا امرِ محال ہے ---- میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانۂ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

جنگ کے خاتمہ پر، حکومتِ برطانیہ نے اہلِ ہند کے تعاون کا صلہ اس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے، امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں معصوم انسانوں کا قتل، ہلاکو اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خونریزیوں کی داستانوں کو فراموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناحؒ نے کہا:۔

> رسوائے عالم رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے، ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے ہیں۔

اسی قسم کے تھے مسٹر جناحؒ کے جذباتِ تہوّر اور آزادی کے وہ مظاہر جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوکھلے جیسے عظیم ہندو راہنما نے کہا تھا کہ

> ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی، وہ جناحؒ ہی کی بدولت ہوگی۔

مسٹر جناحؒ کے اس بے لوث کردار کی بنا پر، لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے مخالف تھے۔ اس دوران میں، وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مدِّمقابل کانگریس کا امیدوار تھا۔ "بمبئی کرانیکل" چوٹی کا نیشنل روزنامہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ووٹروں سے مسٹر جناحؒ کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ

> ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے — علاوہ بریں جناحؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت بڑا امتیازی مقام عطا کر دیا ہے — اگر معمولی اختلاف کی بنا پر جناحؒ جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

قائدِ اعظمؒ نے کوئی انتخابی مہم شروع نہ کی لیکن ان کے ہندو دوستوں نے از خود قریب ایک سو ووٹ فراہم کر دیں اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

———(۰)———

اس وقت تک ہم مسٹر جناحؒ کی زندگی کے اس حصہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان کی قومی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملّتِ اسلامیہ کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سرِ آغازِ داستان اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاستِ عالم کا موجودہ دور، میکیاولی کہلاتا ہے۔ جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکّاری، عیّاری، وعدہ فراموشی، پیمان شکنی وغیرہ سب جائز قرار پا جاتے ہیں۔ جو جس قدر شاطر اور چالباز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجسّمے نصب کرتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار میں قائدِ اعظمؒ کے بالمقابل انگریز، ہندو اور تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ہندو، اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۴۸ء میں، پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:۔

> کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندو مت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندو مت ہزاروں سال مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

اس ہندو مت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا۔ جسے اس کی قوم "مہاتما" کہتی، اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس "مہاتما" کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان

کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جیب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو ان پر ربت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستاں ہیں، معمہ ہیں۔

بہرحال، یہ تھے وہ حریف جن سے قائداعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دورِ سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف، ان کے کسی بد سے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مکر گئے ہوں۔ صاف، سیدھی دو ٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم۔ یہی تھی ان کی وہ خصوصیتِ کبریٰ جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، دنیا کے مشہور ترین اخبار — لندن ٹائمز — نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

دیانتدارانہ سیاست

لندن ٹائمز کے ان ریمارکس کی تائید میں قائداعظمؒ کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ مسٹر اصفہانی نے اپنی کتاب QUAID-E-AZAM, JINNAH AS I KNOW HIM. میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلا مقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخ نامزدگی سے دو دن پہلے، بالکل خلافِ توقع، ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریق مقابل کا یوں سامنے آ جانا وجہ پریشانی ہو گیا۔ ایک شام (محترم) عبدالرحمان صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریق مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرِ ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائداعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائداعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ

تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریق مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور

کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی قائدِ اعظمؒ نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ دورِ حاضرہ کی میکیاولی سیاست میں اخلاق کے دو ضابطے ہیں۔ پرائیویٹ زندگی کے لئے اور ضابطہ۔ پبلک زندگی کے لئے اور۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں:۔

(دورِ حاضرہ کی سیاست میں) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" سمجھیں گے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO MORALS, P. 130)

اور اسی بنا پر اٹلی کے مشہور مدبر (CAVOUR) نے کہا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔ (انسان نے کیا سوچا؟ صـ ۲۲۵)

قائدِ اعظمؒ بھی اسی دور کے سیاستدان تھے اور ان کے فریق مقابل بھی اسی سیاست کی بساط بچھائے ہوئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ ان کے اصولِ سیاست کیا تھے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا: "میرے عزیز! یاد رکھو۔ پبلک زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ (پرائیویٹ زندگی میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن) پبلک زندگی میں بددیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا ایسے لوگ بے راہرو ہو جاتے ہیں، جن کا آپ پہ اعتماد ہوتا ہے۔"

مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانتدار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے، اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟ بالفاظِ دیگر جو دیانتدار نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔

———— (۰) ————

کلکتہ کے انتخاب سے کہیں زیادہ اہم ایک اور انتخابی مہم درپیش تھی۔ سنہ ۴۶-۴۷ء میں مسلم لیگ وزارتیں قائم کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ۳ مارچ سنہ ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفیٰ دیا تو گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیلِ وزارت کے لئے کہا۔ عددی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کر لیں اور جب

آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نپٹ لیا جائے۔ قائداعظمؒ اس پہ سخت برافروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ

آپ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو، میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا اور یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت تشکیل کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر نے پنجاب میں آرٹیکل ۹۳ نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی ——— (ماہنامہ المعارف لاہور۔ بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء۔ حصہ انگریزی۔ صفحہ ۳۰) *

مسلم لیگ فنڈ

ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ جو شخص دیانتدار نہیں وہ انسان ہی نہیں۔ دیانتداری کی سب سے بڑی کسوٹی روپیہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی انجمنوں، تنظیموں، جماعتوں اور معتبر شخصیتوں کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ قائداعظمؒ کو اس ذمہ داری کا ایسا شدید احساس تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لئے فنڈ کی اپیل کی تو ہر روز سینکڑوں منی آرڈروں پر خود دستخط کرتے تھے۔ آپ سوچئے کہ قائداعظمؒ جیسے مصروف اور نحیف و نزار شخص کے لئے ہر روز اتنی تعداد میں منی آرڈروں پر دستخط کرنا کس قدر دوبھر تھا۔ لیکن وہ خوشی خوشی ایسا کرتے۔ وہ بار بار اپنی انگلیوں کو سہلاتے اور پھر دستخط کرنا شروع کر دیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے تو فرماتے کہ "فنڈ کی اپیل میں نے کی ہے۔ لوگ میرے اعتماد پہ پیسے بھیجتے ہیں۔ مجھے ایک ایک پیسے کا حساب

* نوائے وقت کی اشاعت بابت ۴ جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممدوٹ وزارت کا قصہ اس طرح نہیں تھا جس طرح المعارف میں لکھا گیا ہے۔ چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر صاحب نے، ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد شدہ قائداعظم سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں، قائداعظمؒ کی اصول پرستی کی تائید میں یہ واقعہ درج کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ بعد میں المعارف میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا فیصلہ محترم جسٹس منیر اور مراسلہ نگار ہی کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان واقعہ کے مطابق ہے۔ مراسلہ نگار نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔

جیسا کہ پرویز صاحب نے متعدد بار کہا ہے یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت تک نہ تو تحریک پاکستان کے متعلق کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی قابل اعتماد سوانح حیات۔ ان حالات میں واقعات کی جزئیات میں اختلاف ممکنات میں سے ہے۔

لیکن اصل سوال قائداعظمؒ کی اصول پرستی کا ہے جس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (طلوع اسلام)

دینا ہوگا۔ اس لئے رسیدیں مجھے ہی دینی چاہئیں"۔

آپ اس جواب کے آخری الفاظ پر غور فرمایئے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ "مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ سے حساب مانگنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس لئے اس سے مطلب یہ تھا کہ مجھے ان کے پیسوں کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا۔ اور یہی ہے دیانتدار ہونے کے لئے بنیادی راز۔ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ مجھے ایک ایک پائی کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا، وہ بددیانت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ خدا پوچھے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہوگئے تو ان کی یہ روش تھی کہ جس کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اس کمرے کا بلب خود بجھا دیتے۔ اور مختلف کمروں میں چلتے پھرتے تو بلب جلانے اور بجھانے کا عمل متواتر ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ کہا کرتے کہ

اسراف گناہ ہے۔ اور اگر وہ روپیہ قوم کا ہے تو اس میں اسراف گناہِ عظیم ہے۔

(اصفہانی ۱۲۵)

یہ تھا قائداعظمؒ کا کردار! انہوں نے مسلم لیگ کنونشن (سنہ ۱۹۴۲ء) کی افتتاحی تقریر میں اس سوال کے جواب میں کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:۔

عزتِ نفس۔ دیانت۔ امانت۔ یقین محکم اور قومی مفاد کی خاطر، اپنے آپ کو محو کر دینے کے لئے ہر وقت آمادگی۔ ان امتیازات کی شدتِ احساس کو کیریکٹر کہا جاتا ہے۔

یہی تھا قائداعظمؒ کا وہ کردارِ بلند جس کے اعتراف میں "دی گریٹ ڈیوائڈ" کے مصنف "ایچ وی ہڈسن" نے لکھا تھا کہ

قائداعظمؒ کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف، بددیانتی، یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا۔ انہیں کوئی شخص، کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی وہ مرغِ باد نما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا رخِ کردار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔ وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین۔ عزتِ نفس و حمیت کے پیکر تھے۔

(تخلیق پاکستان۔ انگریزی۔ از جمیل الدین احمد۔ صفحہ ۲۶۶)

علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ؎

وہی ہے بندۂ حر ضرب ہے جس کی ہے کاری ۔۔۔ نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے ۔۔۔ انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور اس سے ہماری نگاہ کا رخ، اقبالؒ جیسے حکیم الامت کی نظرِ انتخاب کی طرف پلٹتا ہے۔ مسٹر جناحؒ ہندی سیاست

کی بوالعجبیوں سے دل برداشتہ ہو کر، گوشہ نشین ہو چکے تھے، دوسری طرف ہندوستان میں، انگریز اور ہندو کی ملی بھگت ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ انہیں مسلمان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جائے۔ لیکن اقبالؒ تو دیدہ ور تھا، اس لئے اس کی نگاہ، سطح سے نیچے اتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں سے اسے وہ گوہر تابدار مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا۔ انہوں نے ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناحؒ کو ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائدِاعظمؒ کے احوال و کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ بھی رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار اور بلندیٔ مقام کی بیّن شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں لکھا:۔

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائدِاعظمؒ کی عظمتِ کردار، نیرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہو جاتی ہے، دوسری طرف وہ، حکیم الامتؒ کی دیدہ وری کی بھی بیّن شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں، کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا۔ اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر صحیح کر دکھایا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۸ء میں لکھے تھے۔ اس دوست نے علامہؒ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے انہیں لکھا تھا:۔

> میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملّت تک مکمل صورت میں، پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ (نوائے وقت ۹ رمارچ ۱۹۷۷ء)

اور اب ٹیپ کا بند سنیئے۔ قائدِاعظمؒ نے ۲۵ رمارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبالؒ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

> اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہا اور اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبالؒ کی تصنیفات ہیں، تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو، تو میں اقبالؒ کی

تصانیف کو ترجیح دوں گا۔ (ذکرِ اقبالؒ عبدالمجید سالک۔ صفحہ ۲۲۶)

عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کون سے پاپڑ بیلتے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائدِ اعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں، جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے، لیکن جب وہ قائدِ اعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کے لئے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے سٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی، اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے لیکن آگے جا کر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائدِ اعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر، انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے ملّی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہو گا ——— اسلامی لباس سے اس زمانے میں مراد شیروانی، شلوار یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہو گا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناحؒ صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعۂ فال مجھ دیوانے پر پڑا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے قائدِ اعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی، اور جذبات کی شدّت کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر، قائدِ اعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سنا، اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں آیا، انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے، میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ "کیا تم لوگ مجھے مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناحؒ ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہو گی تو یہ خود بخود مقبولِ انام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہو گا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دلعزیزی بڑی ناپائدار ہو گی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔ لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہو گی جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو"۔ یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیبِ سر کر لیا۔ اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گزرے۔

———(۰)———

اب "مہاتما" کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جایئے جس کی طرف قائدِ اعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم

ہوگا وہ ایک دھوتی پہنے، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور دہلی میں بھنگی کالونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۵ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے تقسیم ہند کے سلسلہ میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا تھا کہ اس نے ایک دن مسز سروجنی نیڈو سے کہا کہ

> میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں، اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ

> ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں، جنہیں ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے، انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بڈھے" کو اس طرح مفلسی اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگرس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔

بہرحال، یہ تھا قائداعظمؒ کا حسنِ کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

> جناحؒ کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔ وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔

اس نے (بی۔ بی۔ سی) کے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مسٹر جناحؒ پاکستان کو ایک مسلم سٹیٹ کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے دیوانہ تھا۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء)۔

انگریز کے خلاف

جن لوگوں کے دل میں تحریکِ پاکستان کے خلاف خبثِ باطن اور قائداعظمؒ کے خلاف، آتشِ انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر، منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ ہند، انگریزوں کی سکیم تھی اور قائداعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔ اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے

واضح ہوگا کہ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح للکارا، اور کس طرح ہر موقع پر ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوگئے، جب انہوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر، ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برملا کہا کہ

> اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دینگے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا۔ اس ظالمانہ اقدام سے برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھینچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائداعظمؒ کے خلاف یہ الزام عائد کر دیا کہ

> مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناحؒ صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

تو انہوں نے کھٹ سے جواب دیا کہ

> یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے۔

قائداعظمؒ تو یہ کہہ رہے تھے، اور مسٹر گاندھی جو قائداعظمؒ کے خلاف اس قسم کے الزامات تراش رہے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کے جریدہ اسٹیٹسمین میں برطانوی سامراج کے علیٰ حالہ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ

> تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولاں گاہ بنا لیں گے ..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ معلوم ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست برد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود ہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا۔ اس کے برعکس قائداعظمؒ

لندن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ

> میں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سامنے ہیں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے بنابریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں، ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا جس میں انتہائی پُرجلال انداز میں کہا کہ

> میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار ڈیلی ہیتیل کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ

> مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرح کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا، اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے، اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس موضوع پر میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا، لیکن قلتِ گنجائش اس کی مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے خبثِ باطن کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہو گئی ہو گی کہ تقسیمِ ہند کی سکیم برطانیہ کی تخلیق تھی، اور قائدِ اعظم اس کے آلۂ کار بن کر کٹھ پتلی کا رول ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان شہادات میں اگر کسی

اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ تقسیم ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، ۱۹۷۵ء کے اواخر میں بی۔ بی سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈکاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے سوال کیا گیا کہ

کیا اس وقت، ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اُسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، تو چاہتے تھے کہ اُسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناح۔ صدر مسلم لیگ۔ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں، اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

---(۰)---

قائداعظمؒ کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ جو کھی لڑائی اس انداز سے لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ گھیراؤ کے فسادات برپا کئے۔ نہ شورشیں اٹھائیں، نہ اینٹ پتھر برسائے۔ صرف اپنے تدبر، فراست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت کی کہ تاریخ اس پر آج تک انگشت بدنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، البتہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی کلب میں انہوں نے اپنی محترمہ بہن، مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ

جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے، تو میری بہن ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکرات، پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے، میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپروائی سے کام نہیں لیا، کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا۔

ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ کہ موت تک کے مقابلہ کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔ (فاطمہ جناح۔ "میرا بھائی" بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۲۰)

جب ۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظمؒ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بمبئی کے مشہور کانگریسی ہفتہ وار اخبار بلٹز نے لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناحؒ کی لیڈرشپ (قیادت) کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ لیگ نے پچھلے ہفتے جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بےساختہ یہ آرزو اُبھرتی ہے کہ کاش! انڈین نیشنل کانگریس میں، جناحؒ جیسے مسلّم الثبوت تدبّر کا ماہر کوئی ایک لیڈر ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناحؒ کے اس فیصلے نے، انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس عامیانہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلم لیگ، برطانوی استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔

(اصفہانی۔ ص ۱۵۸)

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں اس راز کو منکشف کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ایسے وقت بھی آئے تھے جب ہر آن ان کی گرفتاری کا امکان تھا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی بہن، محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جاں نثارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے افشا کیا۔ لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی انہوں نے، کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس میں اقربا نوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملّی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اقربا نوازی کا ایک موقعہ ان کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمشیرہ، محترمہ شیریں بائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

جب مرحوم چندریگر نے قائدِ اعظمؒ کے لائق بھانجے، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائدِ اعظمؒ کو پیش کی تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی "نااہلیت" یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔

(جنگ کراچی۔ ۹ جولائی ۱۹۷۲ء۔ بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائدِ اعظمؒ کے حسنِ کردار ہی کا نہیں، دور بینی اور مآل اندیشی کا بھی اندازہ لگائیے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ "اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے، لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر بھروسہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر

یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے۔ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کرکے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ (بس یہ ہے ہمارا سازوبراق اور اسلحہ اور فوج)۔

(عربک کالج۔ دہلی ۱۹۴۲ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس سازوسامان کے ساتھ لڑنے والا قائد، کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائداعظمؒ کے اپنے الفاظ میں یہ اخلاقی قوت، جرأت، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

لیکن ان چار میں ایک اور چیز کو بھی شامل کرنا چاہیئے اور وہ ہے خونِ جگر جس کے بغیر اقبالؒ کے الفاظ میں، ہر نقش ناتمام رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبال میں تو خونِ جگر — کے الفاظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن قائداعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی تھی۔

قائداعظمؒ کی صحت

یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دلسوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کرسکوں گا۔ آپ بھی دل تھام کر سنیئے۔ قائداعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آرہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا بیان ہے کہ

> ہم ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے قائداعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائداعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اچانک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنا شروع کر دیں جیسا کہ کسی آدمی کو گرم لوہے کی سلاخ سے چھوا جائے۔ میں اسی لمحے ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ دریافت کی اور قائداعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے دردزدہ جگہ کی نشان دہی کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے دردزدہ جگہ کو ہاتھ لگایا تو نا امید ہو کر اگلے سٹیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرم مالش دینے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کروایا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو میں نے گارڈ کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ تکیئے میں لپیٹ کر بوتل کو ماؤف جگہ پر رکھا جس سے درد میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔
>
> (میرا بھائی۔ ص۲)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس

کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دُور تھی تو قائدِ اعظمؒ اپنی نشست سے اُٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کے لکڑی سے بنے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی۔ قائدِ اعظمؒ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تکان اور کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر قائدؒ میرے کندھوں کا سہارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے گاڑی سٹیشن پر پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائدِ اعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور زور سے چلّا کر کہا کہ زیادہ شور نہ کریں کیوں کہ قائدِ اعظمؒ تکان اور بخار کی وجہ سے بستر پر ہیں۔ دوڑ کر ڈاکٹر لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا نبض گر گئی تھی۔　　(میرا بھائی۔ صہ۴۲)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائدِ اعظمؒ آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ سُنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو!　　(میرا بھائی۔ صہ۱۳)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصدِ پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا ــــــ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدّت اور تن دہی کے ساتھ۔ لیکن یہ قوتِ ارادی، فطرت کے اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخر کار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس فدائے ملّت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا ــــ حتیٰ کہ اس میں اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتمد علیہ رازداں، بہن کو بھی شریک نہ کیا۔ یہ راز، راز ہی رہتا اگر اسے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشا نہ کرتے۔ یہ ڈائری ۱۹۷۵ء میں (فریڈم ایٹ مڈنائٹ) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تیزی سے گرتی جانے والی صحت کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے " ایکس رے " لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح دِق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔"

آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکس رے کو کسی کے سامنے آنا چاہیئے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکس رے کی وہ فلم بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی سِل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سربمہر رکھنے سے مقصد کیا تھا، اسے اسی کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربمہر راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیمِ ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

ــــــ (۵) ــــــ

ناقابلِ خرید

اس مردِ مجاہد نے، اس "حادثہ" کو سر بمہر رکھنے کے لئے، اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا یہ خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر، اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم اہلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دُنیا سے چلا گیا۔ ان کی وفات پر، دنیا بھر کے عظیم مشاہیر نے (جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے) انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گل ہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد اہمیت کی حامل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِاعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ ان کی عظمتِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

> میں بڑی مدت سے مسٹر جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے، لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی سکیم پیش کی گئی تو قائدِاعظمؒ نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ سکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِاعظمؒ کو ہمنوا بنانے (بلکہ یوں کہئیے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ

> اگر مسٹر جناح ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر مسٹر جناح لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اپنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائدِاعظمؒ نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر رمزے میکڈانلڈ بے حد متعجب ہوا اور قائدِاعظمؒ سے الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ، یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِّ عمل کیوں ہے؟ قائدِاعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

> اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان - ۱۶ ستمبر ۱۹۷۶ء)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیش کش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیش کش کی گئی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد، تقسیم ہند کی سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے بزرگ ترین لیڈر، مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ

> اگر ملکِ معظم کی حکومت ایک نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگریسی رفقاء کو اس پر

راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیرِ اعظم نامزد کر دے اور اسے قومی حکومت متشکل کرنے کا موقع دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناحؒ کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ اسے بجا طور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔ (طلوعِ اسلام - جون سنہ ۱۹۷۶ء)

قائداعظمؒ نے اسمبلی کی تقریر میں اس کا جواب یوں دیا:-

اگر مسٹر امیرے (یعنی نمائندہ حکومتِ برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیش کش کی ہوتی تو کیا یہ اس وقت بھی میری طرف سے اس کا یہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ مسٹر امیرے اور راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں۔

اور اس تقریر کے آخر میں، یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا کہ

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے۔ ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ جمہوری نظامِ حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ہم اس کا تہیہ کر لیں تو قلتِ تعداد کے باوجود، ہم تمہارے لئے اس سے سوگنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگریس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں، بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔

لارڈ امیرے میکڈانلڈ کو جو جواب ملا تھا وہ آپ پہلے سُن چکے ہیں۔ اب یہ سنیئے کہ ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ لِن لتھ گو کے ساتھ کیا بیتی تھی۔ واضح رہے کہ لارڈ لِن لتھ گو، اپنے رعب داب اور دبدبہ و طنطنہ کے لئے مشہور تھا۔ بات یوں ہوئی کہ وائسرائے نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا، لیکن قائداعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے۔ وہاں جا کر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں" کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:-

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اُٹھتی ہے کہ ہندوستان میں، مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے

منہ پر کہہ دیا کہ وہ ایسے کیا سمجھتا ہے جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔

(ص ۲۵۲)

اس سے بہت پہلے مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۱۲ر جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

(۰)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ایسا کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے قائداعظمؒ کی سیرت کا بنظر تعمق مطالعہ کیا ہے نہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ جنہیں یہ سعادت نصیب ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے کس قدر خلاف تھی۔ ایک واقعہ سنئیے جسے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری (سید مطلوب حسن صاحب) نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے:۔

ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائداعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائداعظمؒ نے یہی سوال اس کپتان پر دہرایا۔ اس نے کہا کہ بے شک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ اس پر قائداعظمؒ نے پوچھا کہ تم کس بنا پر ایسا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بنا پر کہ ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائداعظمؒ نے اس کی طرف خفتہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہوگے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

(نوائے وقت۔ ۴ر جنوری سنہ ۱۹۷۷ء)

بات واضح تھی کہ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا۔ اور ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے، قائداعظمؒ کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی عظیم ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنے تمام رفقاء کے مقابلے میں قائداعظمؒ کا مقام کس قدر بلند تھا لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں مخلص کارکنوں کا کس قدر احترام تھا؟ اس کے متعلق اصفہانی صاحب کی زبان سے سنئیے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

رفقاء کا احترام

یہ اس شام کا واقعہ ہے جب سنہ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے اور راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر جناحؒ اور مس فاطمہ جناحؒ کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے قائداعظمؒ سے اجازت چاہی تاکہ ہم ان کے سیشن میں پہنچنے سے پہلے مجلس عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہتے، انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جائیے۔ ہم اکٹھے سیشن میں

جائیں گے۔ ہمارے لئے یہ فرمان بڑا تعجب انگیز تھا۔ لیکن ہمیں سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں پنڈال میں پہنچے، اور میں اور راجہ صاحب دروازے پر ٹھہر گئے تاکہ قائدِاعظمؒ اور ان کی ہمشیرہ آگے تشریف لے جائیں اور ہم پنڈال میں اُن کے بعد پہنچیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قائدِاعظمؒ آگے نہ بڑھے اور ہم سے کہا کہ ہم چاروں ہمدوش ایک ہی لائن میں پنڈال میں داخل ہوں گے۔ ہم لاکھوں کے مجمع میں اس طرح چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ انہوں نے انتہائی مسرت کے لہجے میں کہا۔ "میرے عزیزو! کیا تم اس منظر کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم نہیں اٹھتے؟ اس لاکھوں کے مجمع کو دیکھو اور پھر سوچو کہ ہم نے تھوڑے سے وقت میں اتنی لمبی مسافت طے کر لی ہے۔ میں آج آپ کو ساتھ لے کر اس لئے پنڈال میں داخل ہوا ہوں کہ میں اس احترام کا اظہار کر سکوں جو آپ کا میرے دل میں ہے اور ان لاکھوں ناظرین کو دکھا سکوں کہ میں تمہارے خلوص خدمات کی اتنی قدر کرتا ہوں۔ (صفحات ۱۰۸-۱۰۷)

سوچئے کہ کیا ڈکٹیٹروں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے؟

امیر المؤمنین

مسٹر اصفہانی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

ایک دفعہ اُن کے بعض مداحوں نے جوشِ عقیدت میں انہیں امیر المؤمنین کہہ کر پکارا۔ انہوں نے فوراً روک دیا اور کہا کہ میں امیر المومنین نہیں ہوں۔ میری تعریف میں حد سے مت بڑھو۔ (ص ۱۱۸)

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ قائدِاعظمؒ کو جس قدر گہرا تعلق تھا اور وہاں کے طلبا کے دل میں ان کا احترام جس قدر تھا اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ان کے پاس اس احترام اور عظمت کے پیشِ نظر اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری کی پیش کش کی لیکن قائدِاعظمؒ نے اسے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں مسٹر جناحؒ ہی اچھا ہوں، آپ کا شکریہ!

(قائدِاعظمؒ کی خطوط وکتابت مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ۔ ص ۲۰۹)

---(۰)---

عام تاثر یہ ہے کہ قائدِاعظمؒ صاحب دیانس قسم کے قانون داں اور ان خشک مزاج انسانوں میں سے تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں۔ ان کی شخصیت علامہ اقبالؒ کے اس مثالی کردار کی زندہ پیکر تھی، جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ سہ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے ‏ ‏ تنے محکم تر از سنگین حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے ‏ ‏ چو جوئے در کنارِ کوہسارے!

حسِ لطیف

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم اور پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انسان

جذباتِ لطیف سے عاری ہو وہ انسان نہیں، حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ حسِ مزاح اسی ذوقِ لطیف کی مظہر ہوتی ہے اور قائدِ اعظمؒ کو اس کا بہرۂ وافر عطا ہوا تھا، اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق کرنا جانتے تھے۔ اُن کا نشتر ٹھیک ٹھکانے پر لگتا جس سے ان کے ہدف کی کیفیت یہ ہو جاتی کہ ـــــ جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور ـــــ اور جب اُن کا ہدف گاندھی جیسا مکار حریف ہوتا تو اس طنز کی شوخی رنگین تر ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام مہاتما جی شیوگاؤں میں اپنی کٹیا میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بڑا سا سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد چکر لگایا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے مہاتما جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائدِ اعظمؒ کے پاس آ گئے۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہے؟ آپ نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے؟ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ پھر سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک توجیہ کیا ہے؟ فرمایا (PROFESSIONAL ETIQUETTE)

یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جا سکتا ہے، تشریح نہیں کی جا سکتی۔ تشریح کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیا جائے۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے۔ مہاتما گاندھیؒ پر اس سے کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تھی اس مردِ آہن کی حسِ لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

ــــــــــ (۰) ــــــــــ

اب ہم زندگی کی اس شاہراہ کی طرف آتے ہیں جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں وہ گھاٹیاں آتی ہیں جن پر بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے تھے لیکن قائدِ اعظمؒ اس دشوار گزار اور ملوث راستے سے بھی پاکیزہ پا گزر گئے۔ اس راستے کا تعلق جنسیات سے ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی پہلی شادی، ان کے والدین نے ان کے بچپن کے زمانے میں کر دی تھی اور وہ بیوی بھی جلد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ۴۰ سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ان کا یہ تمام عہدِ شباب، سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ گزرا، دراں حالیکہ دولت، شہرت، قابلیت کے لحاظ سے بھی ان کا شمار ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا اور اس کے علاوہ مردانہ حسن و رعنائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کا ایک ممتاز ترین اور متمول ترین خاندان تھا جس کے سربراہ سر ڈنشا پیٹیٹؒ کی اکلوتی لڑکی رتن بائی، حسنِ سیرت و صورت میں بے مثال تھی۔ یہ دونوں شادی پر رضامند ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ سر ڈنشا، ایک مسلمان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے؟ لیکن بیٹی کے اصرار پر انہیں بالآخر رضامند ہونا پڑا۔ معاملہ یوں طے پا گیا تو مسٹر جناحؒ نے یہ شرط عائد کر دی کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، تب شادی ہو سکے گی۔ اس پر سر ڈنشا کے خاندان میں کہرام

ہو گیا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس شرط پر اصرار سے یہ رشتہ استوار نہیں ہو سکے گا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے "لَو میرج" سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ شادی (سول میرج) کے طریق سے بھی انجام پا سکتی تھی لیکن مسٹر جناح اپنی شرط پر قائم رہے اور شادی نہیں کی جب تک مس رتن بائی نے اسلام قبول نہیں کر لیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مسٹر جناحؒ قائدِ اعظم نہیں بنے تھے۔ فقط مسٹر جناحؒ تھے۔

یہی وہ شادی تھی جس کے خلاف ہمارے ہاں کے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کے مدعیوں نے یہ افتراء پھیلا دیا تھا کہ ؎

اِک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا ۔ یہ قائدِ اعظمؒ ہے کہ ہے کافرِ اعظم

اس رفیقۂ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں اور بھی کئی عناصر کارفرما ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حق گوئی اور بیباکی کی وہ خصوصیت تھی جو خود قائدِ اعظمؒ کے کردار کا بنیادی حصہ تھی۔ اُس کی شہادت ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر اور مسز جناح اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ ریڈنگ) کے ساتھ لنچ تناول فرما رہے تھے۔ دورانِ گفتگو وائسرائے نے مسز جناح سے کہا کہ وہ جرمنی جانا چاہتے ہیں لیکن ایسا کر نہیں سکتے۔ مسز جناح نے کہا کہ کیوں؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہاں کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس پر مسز جناح نے کھٹ سے کہا کہ "پھر آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے ہیں"؟ (ڈان کراچی ۲۸/۱۱/۷۶ء)

غور فرمائیے کہ کیا یہ خود مسٹر جناح کی صدائے بازگشت نہیں؟

سحرِ فرنگ

مسز جناح سنہ ۱۹۲۹ء میں وفات پا گئیں اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے بقیہ ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ اس دوران میں انہیں کس کس قسم کی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، اس کی ایک مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ تقسیمِ ہند کی گتھی سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی ایڈوینا بھی تھی۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ "محترمہ" کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے اور یہی تھے وہ ریشمیں جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا اگر رچرڈ ہوگ کی مرتب کردہ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگری کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:۔

اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا مسئلہ تقسیمِ ہند کی گفت و شنید کے لئے جو (انگریز) اربابِ حل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اس میں سرِ فہرست ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اوّلین ہدف جواہر لال نہرو تھا۔ وہ مجرّد

تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ (ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پا لیا) یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً برا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیشِ نظر رکھئیے کہ ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔

حتیٰ کہ گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا ـــ اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت، نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔

آپ اس جادوگری کے "حصار" سے باہر نکل آئیے اور فخر و مباہات سے (HOUGH) کے اس اعتراف کو پڑھئیے کہ "اس سارے ہجوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا ہو تو وہ قائدِاعظمؒ محمد علی جناحؒ تھا۔" اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ ٹیلر نے (جو کسی زمانے میں وزیرِ ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ

> ماؤنٹ بیٹن جناحؒ کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لئے تھے۔ جناحؒ اسے کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہمیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہئیے تھا کیونکہ) جناحؒ وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناح کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا، لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناحؒ میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام۔ تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجالس میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر، محض اس کی آمد سے تمام شرکائے محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا ـــ اپنے اصولوں کا پکا۔ قطعاً نہ جھکنے والا۔ اس سے بات کرنا آسان کام نہ تھا (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

(۰)

آخر میں چند الفاظ اس اعتراض کی تردید میں کہ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ "قائدِاعظمؒ اور معاشی مسئلہ" ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی صرف دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں جنگِ پاکستان اپنی انتہائی شدت پر پہنچ چکی تھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس وقت بڑے بڑے متمول شرکاء کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے صدارتی خطاب کے دوران قائدِاعظمؒ نے فرمایا:۔

سرمایہ دار اور جاگیر دار

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں جو ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں درد انگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

(○)

آخر میں، میں اسے ایک نہایت حسین اور دلآویز مقطع پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے کردار میں کندن کی سی صلابت اور ہیرے کی سی درخشندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس نے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) سیرتِ محمدیہ کی شمعِ نورانی سے کسبِ ضیا نہ کیا ہو۔ قائدِ اعظمؒ کی سیرت کی تابندگی بھی اُس کی رہینِ منت تھی۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ ان کی شیفتگی کا کیا عالم تھا۔ اس کی مثال ہمیں اس زمانے میں ملتی ہے جب ان کی عمر ہنوز سولہ سال کی تھی۔ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے تو سوال یہ سامنے آیا کہ وہ کس درسگاہ میں داخلہ لیں۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

میں نے بالآخر "لنکنز اِن" میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بڑے دروازے پر دنیا کے ممتاز ترین مقننین کی جو فہرست کندہ تھی اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔

(ہیکٹر بولیتھو)

حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلسِ دستورساز سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ناصحانہ انداز میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے روا رکھا تھا۔ یہ سُن کر قائداعظمؒ نے جھٹ سے جواب دیا کہ

غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے لئے ہمیں کسی اکبر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہمارے سامنے ہمارے رسولِ مقبولؐ کا اسوۂ حسنہ ہے جنہوں نے عیسائی اور یہودی اقلیتوں سے ایسی کشادہ ظرفی کا برتاؤ کیا تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملے گی۔ ہم اس رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں گے۔

وہ رسولِ مقبولؐ جن کی شان میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی جشنِ میلاد النبیؐ کی تقریب میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حضورؐ کی عزت و تکریم کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین۔ انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز ایسی عظیم بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا، اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسولِ اکرمؐ عظیم مصلح تھے۔ عظیم ترین رہنما تھے۔ عظیم واضعِ قوانین تھے۔ عظیم سیاستدان تھے۔ عظیم حکمران تھے (صلے اللہ علیہ وسلم)۔

———(٥)———

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ کی اُس عظمتِ کردار اور رعنائیِ سیرت کی چند جھلکیاں، جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں جنگ لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی۔ تاریخِ عالم کا یہ، یقیناً ایک منفرد واقعہ ہے۔ طاب لہٗ حسن مآب۔

شادابیوں اور کامرانیوں کی اس قسم کی پُر مسرت داستان کے بعد، میں آپ کی آنکھوں کو غم کے آنسوؤں سے نم آلود نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ؎

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج؟
نالہ ردکا تھا کہ یہ پردہ در راز نہ ہو

مجھے جب بھی، حالاتِ مابعد کے تناظر میں اُن حسین خوابوں کی یاد آتی ہے، تو دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ ؎

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں!
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے!

پرویز

———(٥)———